بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

دنیا کی کسی انقلابی تحریک کو اگر کسی اجتماعی جدوجہد سے تشبیہ دی جا سکتی ہے تو وہ کسی قافلے کا ایک خاص منزلِ مقصود کی طرف رواں دواں ہونا ہے۔ قافلے کو ترتیب دینے والا سب سے پہلے منزل کا تعین کرتا ہے۔ پھر اس منزل تک رسائی میں جو مادی اور روحانی کامرانیاں اسے نظر آتی ہیں ان سے عامۃ الناس کو روشناس کراتا ہے اور انہیں زیرِ ترتیب قافلے میں شریک ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ پھر جب قافلہ چلنے کے لیے تیار ہوتا ہے تو اس کے لیے زادِ راہ کا انتظام کرتا ہے، شرکاء قافلہ کی صلاحیتوں، استعدادِ کار اور جذبہ و شوق اور مقصد کے ساتھ لگن کا جائزہ لیتا ہے۔ اور انہیں اس راہ کے نشیب و فراز سمجھاتا ہے اور اس راہ پر پہلے جو قافلے گامزن ہو چکے ہیں اُن کی کامیابیوں اور ناکامیوں اور ان کے اسباب و علل سے انہیں پوری طرح آگاہ کرتا ہے۔ اور اس راہ میں جو حوادث اور مصائب خاص خاص مقامات پر اُسے پیش آ سکتے ہیں اُن کی نشاندہی کرتا ہے۔

جماعت اسلامی اپنی ساری کمزوریوں اور کوتاہیوں کے اعتراف کے باوجود کسی فخر کی بناء پر نہیں بلکہ بڑے انکسار کے ساتھ یہ بات علیٰ وجہ البصیرت کہتی ہے کہ اس کی منزلِ مقصود وہی ہے جو انبیاء علیہم السلام کی تھی اور جس کا نہایت واضح طور پر تعین خاتم المرسلین سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اور اس کے کارکن اس منزل تک پہنچنے کے لیے اپنی حد تک اُسی جادہ مستقیم پر گامزن ہونے کی کوشش کر رہے ہیں، جن پر پاکباز لوگوں نے چل کر منعم حقیقی کی رضا اور خوشنودی حاصل کی اور دنیا اور آخرت میں اس کی نعمتوں سے بہرہ ور ہوئے اور ان خوفناک راستوں سے بچنے کے لیے فکرمند رہتے ہیں جو ضلالت اور گمراہی کی طرف لے جانے والے اور خدا کے غضب کو برانگیختہ کرنے والے ہیں۔

جماعت اسلامی کی جدوجہد کا مقصد بجز اس ایک مقصد کے اور کوئی نہیں کہ انسان کو انسان کی

غلامی سے آزاد کرا کر اپنے خالق اور مالک کا غلام بن کر رہنے کا سلیقہ سکھایا جائے۔ خداوند تعالیٰ کی بندگی اور اس کی غلامی اگرچہ بڑی دلکش اصطلاحیں ہیں اور انسان ان کی دلکشی سے مسحور ہو جاتے ہیں لیکن جب کوئی شخص قرآن و سنت کی روشنی میں ان کے مضمرات پر غور کرتا ہے اور تاریخ کے دریچے سے اُن لوگوں کے مصائب و شدائد پر نگاہ دوڑاتا ہے جو بندگیِ رب کے علمبردار بن کر اٹھے تو پھر پہاڑ پر قرآن حکیم کے نزول سے اس کے لرزاں و ترساں ہونے کا عقدہ کسی حد تک کھل جاتا ہے۔ اگر بندگیِ رب محض ایک تصور اور نظریہ ہوتا تو پھر یہ کسی وجہ سے بھی باعث اضطراب نہ تھا۔ نہ اس نظریہ کے اپنانے والوں کو اس کی عظیم ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے لرزہ براندام ہونے کی ضرورت پیش آتی اور نہ اس نظریہ کے مخالفین کو اس سے کوئی ایسا شدید خطرہ لاحق ہوتا جس سے اُن کی نیندیں حرام ہو جاتیں۔ اس نظریہ کے قبول کرنے والے محض ذہنی آسودگی کی خاطر اسے قبول کرتے اور اس کے مخالفین جذبہ رواداری کے تحت اسے بخوشی برداشت کرتے۔ بندگیِ رب کے دعوے ٰ میں اصل مشکل کا آغاز وہاں سے ہوتا ہے جہاں یہ عقیدہ انسان سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ تم ساری بندگیوں کو چھوڑ کر خواہ یہ بندگی وقت کے جابروں اور قہاروں کی ہو، سرمایہ داروں اور زرداروں کی ہو یا عوام کے مذہبی جذبات سے ناجائز فائدہ اٹھانے والوں کی ہو، یا اپنے مفادات اور اپنے نفس کی ہو، خدائے واحد کی بندگی اختیار کرو۔ اسلام کا کلمہ طیّبہ گو نہایت ہی مختصر سا کلمہ ہے لیکن اس میں ایک مسلمان پر احقاق حق اور ابطال باطل کے سلسلے میں جو غیر معمولی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں انہیں بڑی خوبصورتی کے ساتھ سمیٹ دیا گیا ہے۔ بندگیِ رب کا دعویدار اس کلمہ کو زبان سے ادا کر کے اس عزم کا خلوصِ دل سے اظہار کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے معاملے میں تمام معبودانِ باطل کی غلامی کا جوا اتار کر خدائے واحد کی غلامی اختیار کرے گا کیونکہ یہی اس کے نزدیک خالق کا بندہ ہونے کی حیثیت سے اس کے لیے صحیح راستہ ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ باطل کی ہر صورت کو مٹانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دے گا۔ یہ کلمہ اگر بندۂ مومن کے لیے قوت و طاقت کا سرمدی سرچشمہ ہے تو معبودانِ باطل کے لیے خوفناک چیلنج بھی ہے جسے سنتے ہی اُن کے حلقوں میں کھلبلی مچ جاتی ہے۔ اور باطل اپنے سارے ساز و سامان کے ساتھ میدان میں اتر پڑتا ہے۔ حق جس قدر قوت کے ساتھ آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے باطل اسی شدت کے ساتھ اس کی مزاحمت کرتا ہے۔ لیکن تاریخ کا فیصلہ یہی ہے کہ باطل اہل حق کے لیے سخت مصیبت اور آزمائش کا باعث تو بنتا ہے مگر اس کی پیش قدمی کو روک نہیں سکتا۔ بشرطیکہ اہل حق نے اس راہ کی دشواریوں کو دیکھ کر خود ہمت نہ ہار دی ہو۔

ہمارے پیش نظر اس وقت حق و باطل کی باہمی آویزش کی پوری تاریخ دہرانا نہیں بلکہ اس قافلے کی طے کردہ چند منازل کی نشاندہی مقصود ہے جو پاکستان بلکہ پوری دنیا میں جماعت اسلامی کے نام سے متعارف و معروف ہے۔ اس قافلہ کے سالار نے سب سے پہلے مسلمانوں کو بندگیٔ رب کے حقیقی مفہوم اور اُس کے مقتضیات سے ایک داعیٔ حق کے جوش، تدبر اور دلسوزی کے ساتھ آشنا کیا اور انہیں یہ بتایا کہ دین حق خدا اور بندے کے درمیان کوئی ذاتی تعلق ہی نہیں بلکہ یہ پوری زندگی کو حق پرستی کی بنیاد پر استوار کرنے کا جامع پروگرام ہے اور اس وجہ سے باطل کی ہر صورت کے لیے بربادی اور موت کا پیغام ہے۔ مسلمانوں نے اپنے مذہبی جذبات کی تسکین کے لیے باطل کے اندر اسلام کے لیے جو مختلف گوشہ ہائے عافیت تلاش کرنے کی کوششیں کی ہیں یا اس سے مصالحت کے لیے انہوں نے جو مختلف راستے نکال رکھے ہیں اُن سے وہ مقصد پورا نہیں ہوتا جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے دین کو نازل فرمایا ہے۔ جس طرح روشنی اور تاریکی یک جا نہیں ہو سکتیں بالکل اسی طرح حق و باطل ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ جہاں حق ہوگا وہاں باطل کے لیے کوئی گنجائش نہ ہوگی اور اسے بہر طور وہاں سے اپنی بساط لپیٹنی ہی پڑے گی خواہ وہ معمولی مزاحمت کے ساتھ یہ کام کرے یا پوری طرح پنجہ آزمائی کر کے پسپائی اختیار کرے۔

تحریکِ اسلامی کے قافلہ سالار نے جب مسلمانوں کو دینِ حق کے اس انقلاب انگیز تصور سے آشنا کیا جسے وہ کچھ عرصہ سے بھول چکے تھے تو اس کا مختلف حلقوں میں مختلف ردعمل ہوا۔ بعض نے کہا یہ شخص دینِ حق کو ایک دنیوی تحریک کی صورت میں چلانے کی مذموم کوشش کر رہا ہے۔ بعض لوگ جن کے ذہنوں میں یہ بات اچھی طرح رچ بس چکی تھی کہ دین محض نماز روزے اور چند اخلاقی پابندیوں کا نام ہے انہوں نے اس دعوت کو کسی نئے دین کی تشکیل تصور کیا اور اسے فتنہ سمجھتے ہوئے اس سے خائف ہونے لگے۔ اس وقت کے ایک نہایت ہی واجب الاحترام صاحب حال اور صاحب قال بزرگ، جو کسی پر الزام دھرنے کے معاملہ میں اپنے حلقے کے دوسرے اہلِ علم کی بہ نسبت کہیں زیادہ محتاط سمجھے جاتے تھے، اُن کے سامنے جب اس تحریک کی بنیادی کتب پیش کی گئیں اور ان سے مطالعہ اور اپنی رائے ظاہر کرنے کی درخواست کی گئی تو انہوں نے ان تحریروں کا جائزہ لینے کے بعد ارشاد فرمایا۔ "میں ان میں کسی صریح غلطی کی تو نشاندہی نہیں کر سکتا۔ البتہ دل ان باتوں کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہا۔"

جماعت اسلامی کے قائد اور اس کے افکار و تصورات کے بارے میں جو کچھ بھی پاکستان اور بھارت میں لکھا گیا ہے اس کے معتد بہ حصے کے مطالعہ کا مجھے موقع ملا ہے اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جن اصحاب علم نے خلوص اور دیانت داری کے ساتھ جماعت اسلامی کی دعوت سے اختلاف کیا ہے اس کی سب سے بڑی وجہ دین کا وہ جامع تصور ہے جسے مولانا نے مسلم قوم کے دور انحطاط میں پیش کیا ہے اور جو عام مذہبی ذہن کو اپیل نہیں کرتا۔ ابتلاء اور انحطاط کے دور میں عوام عافیت کے گوشے اور حالات کے دھارے کے ساتھ آرام اور سکون کے ساتھ بہنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ اور اہل مذہب نے اس کا ہمیشہ یہی ایک حل پیش کیا ہے کہ روح کی تسکین کے لیے عبادت اور گیان دھیان تو مذہب کے مطابق کر لیا جائے اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں غالب نظام حیات کی پیروی کی جائے۔ اس سے روح کو بھی غلط یا صحیح ایک طرح کی غذا فراہم ہوتی رہتی ہے اور انسان بغیر کسی تصادم یا بہت بڑی آزمائش کے باطل کی تحریکوں سے فائدہ بھی اٹھاتا رہتا ہے۔ اور "باغباں بھی خوش رہے اور راضی رہے صیاد بھی" کی ذہنی کیفیت کے ساتھ زندگی گزارنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اس ذہنی کیفیت پر لوگوں کو جھنجھوڑا جائے اور انہیں یہ بتایا جائے کہ جس چیز کو تم روحانی سکون اور دنیوی کامیابی قرار دے رہے ہو یہ اللہ کے دین سے یکسر مغائرت رکھتی ہے تو لوگوں کا اس پر برہم ہونا بالکل فطری امر ہے۔ البتہ علمائے کرام سے اس کی توقع نہ کی جا سکتی تھی مگر افسوس کہ انہوں نے بھی اس دعوت پر سنجیدگی سے غور کر کے اس کا ساتھ دینے کے بجائے یا تو معنی خیز سکوت اختیار کیا یا پھر اس شد و مد سے مخالفت شروع کی گویا یہ کوئی نیا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا تھا جس کا مٹانا ان کا فرض تھا۔

حلقۂ علماء سے باہر جو لوگ اہل فرنگ کی زیادہ سے زیادہ وفاداری بلکہ اُس کی بندگی کے ذریعے مسلم قوم کے لیے دنیوی فوائد حاصل کرنے میں منہمک تھے اور اسے اپنی دانست میں بہت بڑی ملی خدمت خیال کرتے تھے انہوں نے بھی تحریک اسلامی کی دعوت کو ملت دشمنی سے تعبیر کیا اور روشن خیال مسلمانوں کو یہ کہہ کر اس سے بدظن کرنے کی کوشش کی کہ اس تحریک کا داعی قرآن مجید کی آیت اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ج کا سہارا لے کر تمہیں سرکارِ انگریزی کی برکات سے محروم رکھنا چاہتا ہے اس لیے تمہیں اس کی آواز پر کوئی توجہ نہ دینی چاہیئے۔ اگر تم نے انگریز سے عدم تعاون کی روش اختیار کر لی تو دوسری قومیں اس سے فائدہ اٹھا کر اس کی منظور نظر بن جائیں گی اور اس طرح تمہارے حصے کے دنیوی فوائد بھی اُن کی جھولی میں

ڈال دیئے جائیں گے۔

اس دعوت کا ردعمل یوں تو زندگی کے ہر میدان میں ظاہر ہوا مگر سیاسی میدان میں یہ خاص طور پر شدید جھگڑوں کی صورت میں نمودار ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب مولانا محترم نے تحریک اسلامی کی بنیاد رکھی اس وقت وطنی قومیت کی تحریک اپنے شباب پر تھی اور مسلم قومیت کا قافلہ بھی ابتدائی منازل طے کر کے جدوجہد کے وسیع میدانوں میں داخل ہو رہا تھا۔ وطنی قومیت کے بت پر جب انہوں نے ضرب کاری لگائی اور لوگوں کو بتایا کہ مغرب میں نیشلزم کی تحریک پروان چڑھنے سے یا دوسرے لفظوں میں وطن کو خدا بنانے سے انسانیت کو کس قسم کے ناقابل بیان مصائب سے دوچار ہونا پڑا ہے اور ہندوستان میں اس تحریک کے جلو میں کس قسم کی بربادیاں آنے والی ہیں تو اس برِاعظم کے تسلیم الفطرت افراد کی ایک معقول تعداد نے اس موضوع پر سوچنا شروع کیا اور اس کی تباہ کاریوں سے ملک کو بچانے کے لیے مشورے ہونے لگے لیکن جو لوگ اس تحریک کے سرخیل تھے ان کے سامنے چونکہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے بجائے ہندوستان میں ہندو قوم کا تسلط اور غلبہ تھا اور یہ مقصد وطنی قومیت کی تحریک ہی سے بطریق احسن پورا ہونے کی توقع کی جا سکتی تھی اس لیے انہوں نے مولانا محترم کی آواز کو ہر طرح سے دبانے کی کوشش کی اور پوری قوت کے ساتھ عوام کے اندر یہ تاثر پھیلایا کہ یہ شخص آزادیٔ ہند کے فیصلہ کن مرحلے پر جو وطنی تحریک کی مخالفت کر رہا ہے تو اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ انگریز کے اشارے پر کیا جا رہا ہے۔ اول تو سادہ لوح عوام کے لیے نیشلزم اور حب الوطنی کے درمیان فرق کرنا ہی مشکل تھا۔ دوسرے اس وقت ہندوستان کی سیاست میں جو جذباتی فضا قائم ہو چکی تھی اس میں تحریک اسلامی کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ گئی۔

وطنی قومیت پر گرفت کرنے کے بعد جب مولانا محترم نے مسلم نیشلزم پر گرفت شروع کی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی خرابیوں کا ذکر کیا تو مسلم قومیت کے علمبردار بڑے برہم ہوئے اور انہوں نے مولانا کے پیش کردہ افکار پر علمی انداز میں گفتگو کرنے اور دلائل سے اُن کی غلطی اُن پر واضح کرنے کے بجائے انہیں ملت اسلامیہ کا دشمن اور تحریک پاکستان کا مخالف قرار دینا شروع کیا اور یہ سلسلہ آج تک چل رہا ہے۔ عامۃ المسلمین کے دماغ مسلم نیشلزم کے اثرات سے اس حد تک متاثر ہو چکے تھے کہ ان کی سمجھ میں یہ بات

نہ آتی تھی کہ اسلام کا داعی آخر مسلم قومیت کی تحریک کے ساتھ شامل ہو کر کیوں نہیں چلتا اور وہ اس تحریک کو جو مسلمانوں کے لیے ایک الگ خطہ ارضی کا مطالبہ لے کر اٹھی ہے کیوں ہدف تنقید بنا رہا ہے۔ مسلم نیشنلزم کے پر جوش حامیوں کی مولانا کے خلاف برہمی کا سبب بجز اس کے اور کوئی نہ تھا کہ وہ شدت جذبات میں اس عظیم فرق کو سمجھنے کے لیے آمادہ نہ تھے جو اسلام بحیثیت مسلمانوں کے قومی دین کے اور اسلام بحیثیت خدا کی طرف سے نازل کردہ واحد دستور حیات کے مابین پایا جاتا ہے اور اس فرق کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے مولانا آج تک معتوب چلے آرہے ہیں۔

جماعت اسلامی کے سیاسی کردار پر ماضی اور حال میں جو لے دے ہوتی رہی ہے اس کا اگر دقت نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ باوجود کوشش کے عوام ابھی تک اس فرق کے مضمرات ٹھیک طور پر سمجھ نہیں پائے اسی وجہ سے وہ بسا اوقات جماعت کے طرز عمل پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں جن میں کہیں کہیں سخت برہمی بھی ہوتی ہے۔

یہ بات اگرچہ بڑی تلخ ہے مگر ہے حقیقت کہ مختلف تاریخی، معاشرتی اور سیاسی عوامل کی وجہ سے اسلام سے گہری محبت اور عقیدت کے باوجود مسلمانوں کا اس دین سے وہ تعلق خاطر نہیں رہا جس کا دین حق تقاضا کرتا ہے۔ اسلام اُن کے نزدیک دوسرے قومی ورثوں کی طرح بس ایک مقدس قومی ورثے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے جس کے ساتھ وہ اپنے آپ کو کسی نہ کسی حد تک وابستہ رکھنے کے لیے مجبور ہیں۔ اس حقیقت کو یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ مسلم قومیت کی تشکیل میں جہاں سیاسی مصالح کی ہم آہنگی، معاشی مفادات کا اشتراک اور معاشرتی اور اخلاقی اقدار کی یکجہتی اور اس طرح کے بعض دوسرے عوامل کارفرما ہیں۔ وہاں ایک دین سے وابستگی بھی اس قوم کے مختلف عناصر کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ لیکن قومیت کے اس نقشے میں دین حق کبھی اجتماعی زندگی کی غایت اولی اور فکر و عمل کا واحد محرک قرار نہیں پاسکتا۔ اسی وجہ سے قومی، معاشی اور معاشرتی تقاضوں کے مطابق جسے عرف عام میں عصری تقاضے کہا جاتا ہے دین کے اندر بھی تبدیلیاں پیدا کرنے کا مطالبہ ہوتا رہتا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں اصل چیز قوم اور اس کے دنیوی تقاضے ہیں اور دین ان تقاضوں کو پورا کرنے کے متعدد ذرائع میں سے ایک مؤثر ذریعہ ہے اور جب

قومی تقاضے تبدیل ہو جائیں تو دین کو اس کے مطابق تبدیل کرنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ دیکھئے کہ اس ملک کے جو افراد یا گروہ بھی مسلم نیشلزم کے جذبہ کے تحت ہماری اجتماعی زندگی میں دین کا مرتبہ و مقام مشخص کرنے میں مصروف ہیں وہ دین کو وقتی تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کو دین کی بہت بڑی خدمت خیال کرتے ہیں۔ مرکز ملت کا تصور بھی اسی ذہنیت کی پیداوار ہے۔ اگر وطنی قومیت کے علمبردار "وطن پہلے اور مذہب بعد کے داعی تھے تو مسلم قومیت کے علمبردار قوم پہلے اور مذہب بعد کے پرجوش مبلغ ہیں اور اس کی عملی شکل جو سامنے آئی ہے وہ یہ ہے قوم مذہب کی تابع نہ ہو اور وہ اپنی اجتماعی زندگی کا نقشہ اس کے مطابق تیار کرنے کی پابند نہ ہو بلکہ قوم دنیوی مفادات کے پیچھے جس وادی میں چاہے بھٹکتی پھرے اور مذہب ایک سچے جانثار خادم کی طرح بڑی نیازمندی کے ساتھ ہر مقام پر اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہے۔

قومی دین کا تصور نیشلزم کی تحریک کے ساتھ ہی پروان چڑھا ہے کیونکہ اس تحریک کی یہ ہمیشہ سے بنیادی ضرورت رہی ہے۔ مذہب آفاقی اقدار کا ترجمان ہوتا ہے۔ وہ انسانوں کے مابین حق و باطل کی بنیاد پر تفریق کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں نیشلزم کو ہر قدم پر اس بات کی احتیاج ہوتی ہے کہ قوم کے مخصوص دنیوی مفادات اور مخصوص حالات کے پیش نظر اخلاقی اور مذہبی اقدار وضع کرے۔ اس لیے وہ کسی ایسے مذہب کی عملداری ایک لمحہ کے لیے گوارا نہیں کر سکتا جو زندگی کے سارے شعبوں پر محیط ہونے کا دعویٰ کرے اور آفاقی اقدار کا علمبردار ہو۔ یورپ میں اصلاح مذہب کے نام سے جو تحریک شروع ہوئی وہ درحقیقت نیشلزم کے فروغ پانے کی وجہ سے قومی مذہب کی ضرورت کا بالکل فطری اظہار تھا۔ قوموں کے دنیوی مفادات اس بات کے متقاضی تھے کہ مذہب کی جو اقدار بھی نیشلزم کو کوئی نقصان پہنچا سکتی ہیں یا قوموں کی صنعتی ترقی یا جوع الارض کی راہ میں حائل ہو سکتی ہیں انہیں نقش کہن سمجھ کر بالکل مٹا دیا جائے۔ اس تحریک کے نتیجے میں یورپ میں قومی چرچ کی بنیاد پڑی۔ اس ضمن میں جن لوگوں کو قومی مفادات کا دشمن یا قومی چرچ کا مخالف سمجھ کر تختہ دار پر لٹکایا گیا اُن میں سے کوئی ایک شخص بھی نہ تو کسی قوم اور وطن کا غدار تھا، نہ اس کے مفادات کا دشمن۔ ان کا قصور لے دے کر صرف یہ تھا کہ وہ مذہبی تعلیمات کو بادشاہوں یا قومیت کے علمبرداروں کی خواہشات کے مطابق تبدیل کرنے پر تیار نہ تھے۔ سر ٹامس مور جسے اس جرم کی پاداش میں قتل کیا گیا اس کے وہ آخری الفاظ تاریخ کے صفحات میں آج بھی محفوظ ہیں جن سے قتل کے اصل

باقی صفحہ ۳۴ پر